میرزا ادیب

میرے محترم استاد

پروفیسر حمید احمد خاں

آج صبح سے آندھی چل رہی ہے۔ اور مجھے ایک خیال بُری طرح ستا رہا ہے۔ آندھی یا تیز ہوا سے میں بالعموم پریشان نہیں ہوتا۔ ہوا تیز و تند ہو تو اس سے حرکت و عمل کا احساس ہوتا ہے، مگر میری آرزو یہ ہے کہ آج ہوا تھم تھم کر چلے، اس میں گرد و غبار بالکل نہ ہو۔ کچھ دیر کے بعد ہوا کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو جائے، اور کتنا ہی گرد و غبار کیوں نہ اڑنے لگے، مجھے کوئی فکر نہیں ہوگی۔ اس وقت تو لازماً فضا کو پرسکون ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ گھنٹے آدھے گھنٹے کے بعد ایک ایسے شخص کو وادیٔ خاموشاں کی طرف اپنے سفر کا آغاز کرنا ہے، جس کی زندگی ہمیشہ بے داغ رہی ہے۔ اگر ایسے شخص کا کفن میلا ہو جائے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے کل ۲۲ مارچ کو دوپہر کے بعد اس دنیا میں آخری سانس لیا تھا اور آج ہم، جو ان کے شاگرد، احباب، عزیز ان کے نئے اور پرانے ساتھی ہیں انھیں آخری منزل پر پہنچانے کے لیے ان کی کوٹھی کے وسیع لان میں جمع ہو گئے ہیں۔

وہ میرے استاد تھے۔ ان کے ساتھ میری شاگردانہ عقیدت وابستہ ہے، لیکن کالج سے نکلنے کے بعد میرے اور ان کے درمیان استاد شاگرد کی بجائے دوستانہ روابط قایم ہو گئے تھے۔ جن میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا، ہم دوستوں کی طرح ملتے تھے۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ اس دوستی کی ابتدا بھی انہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ مجھے دور سے دیکھتے تھے۔ تو خود چل کر میرے پاس آجاتے تھے۔ اور بے تکلفی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے۔ یہ محض ان کی محبت اور شفقت تھی۔ اور اس محبت و شفقت میں ان کا ہر شاگرد برابر کا حصہ دار تھا، کم از کم ان کے رویے سے یہی ثابت ہوتا تھا۔

مجھے پروفیسر حمید احمد خان کو قریب سے دیکھنے کا بارہا موقع ملا تھا۔ اور کئی بار ان کے دل و دماغ میں جھانکنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میرے استاد مجسمہ نفاست تھے، تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہوگا، اجلا لباس پہننا، صاف ستھری جگہ پر رہنا، گرد و پیش کے ماحول میں صفائی رکھنا، یہ نفاست پسندی ضرور ہے، مگر بڑی محدود قسم کی میرے محترم استاد میں تو نفاست پسندی کے بے شمار روپ تھے، اور واقعہ یہ ہے، کہ انھیں نفاست پسندی کا ہر روپ بے حد عزیز تھا۔

اس قدر عزیز تھا کہ وہ اسے کسی حالت میں بھی مجروح صورت میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی نفاست پسندی کا یہ عالم ہے کہ مرنے سے کچھ روز پیشتر وصیت کرتے ہیں کہ ان کے جسد خاکی کو گلبرگ کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ کیونکہ وہ

صاف ستھرا ہے۔ نفاست کو معنویت کی وسیع تر سطح پر لاکر دیکھیں تو یہ عبارت ہے زندگی کی اُجلی اور داغ دھبے سے پاک اور منزہ قدروں سے۔ یہ نظام اقدار پر مشتمل ہے۔ خلوص، راست بازی، راست گوئی، سلیقہ مندی، بے ریا محبت، نیک نیتی، نیک نفسی اور باہمی اعتماد پر۔ کہتے ہیں کہ آرٹ سے زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ مجھے اس نظریے کے تسلیم کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ انسان زیادہ قابلِ احترام ہے، جو آرٹ سے زندگی میں حسن پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی ہی کو آرٹ بنا دیتا ہے، اور پروفیسر حمید احمد خان کی زندگی واقعی ایک آرٹ ہے۔ وہ سلیقہ مندی سے زندگی بسر کرنا جانتے تھے، اور انھوں نے بیشتر برس جو اس دنیا میں گذارے ہیں، آرٹ کی تمام پابندیوں پر عمل پیرا ہو کر گذارے ہیں، اُن کے اس آرٹ کا کمال یہ ہے کہ وقت کا جو لمحہ بھی ان کی زندگی کا جزو بنتا تھا، جب ان سے الگ ہوتا تھا تو ان کے سانس کی عطر فشانی سے نسیمِ بہار کا جھونکا بن جاتا تھا۔ ایسے لوگ خوشبوئیں پھیلاتے ہوئے آتے ہیں اور خوشبوئیں پھیلاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

ان کی نفاست پسندی کو اگر کسی مثال کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کروں تو یوں کہہ سکتا ہوں، کہ زندگی کے خوبصورت قالین پر چلتے ہوئے اگر ان کے پاؤں پر کانٹا چبھ جاتا تو انھیں پاؤں پر زخم لگنے کا افسوس ہرگز نہ ہوتا۔ افسوس ہوتا تو فقط اس بات کا کہ اس زخم سے نکلے ہوئے لہو کے قطروں نے قالین کی نفاست تباہ کر دی ہے۔

وہ سر سے پاؤں تک نفاست تھے۔ نفاست میں نرمی اور ملائمت ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھی وہ نرم اور ملائم نہیں ہوتے تھے۔ دیکھنے والے محسوس کرتے تھے کہ وہ سخت ہو گئے ہیں۔ ان کا رویہ کرخت ہو گیا ہے۔ لیکن یہ بالکل عارضی کیفیت ہوتی تھی۔ برف کے تودے پر ہاتھ رکھیں تو وہ کتنا کرخت معلوم ہوتا ہے۔ مگر کچھ لمحوں کے بعد ہی وہ پگھل کر پانی بن جاتا ہے۔ یہی کیفیت پروفیسر حمید احمد خاں کی بھی تھی۔ وہ جتنی جلدی گرمیِ گفتار کا اظہار کرتے تھے اتنی جلدی ملائمت بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ان کے اندر تو کرختگی تھی ہی نہیں، ان کے باطن میں پنکھڑیوں کی سی لطافت اور شبنم کی سی معصومیت تھی۔ کسی کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آتے تھے تو تھوڑی دیر بعد ہی انھیں احساس ہو جاتا تھا کہ ان کی زندگی کے صاف ستھرے دامن پر ایک داغ سا پڑ گیا ہے۔ اور یہ داغ ان کی طبع نفاست پسند کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ گرمیِ کلام ایک دم ختم ہو کر نرمیِ گفتار بن جاتی تھی! جس سے الجھتے تھے اس سے بعض اوقات معافی مانگ لیتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ ہماری کلاس میں انگریزی کمپوزیشن سکھانے آئے تھے تو طلبہ نے اُن کے ساتھ اسی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا، جو وہ ہر نئے پروفیسر کے ساتھ پوری باقاعدگی سے روا رکھتے تھے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا تھا۔ انھوں نے لڑکوں کو مخاطب کر کے خوب ڈانٹ پلائی تھی۔ مگر جب لڑکوں نے خاموشی اختیار کر لی تو ان کے وطیرے میں ایک ایسی تبدیلی آ گئی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اپنی تلخ گوئی پر دکھ ہے۔ اور وہ اس احساس کو ختم کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ کوئی، سخت گیر استاد نہیں۔

ٹیوٹوریل میٹنگ میں وہ میری نظمیں سنتے تھے اور میری ہر طرح ہمت افزائی کرتے تھے۔ ایک بار بھی انھوں نے نہ بتایا کہ وہ علم و ادب کے ایک مشہور خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، اور خود بھی بہت اچھے افسانہ نگار تھے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں اس زمانے میں نظمیں لکھتا تھا اور پروفیسر حمید احمد خاں افسانے۔ اس دور میں

انھوں نے ایک نہایت خوبصورت افسانہ لکھا تھا، جس کا عنوان تھا، "مصور" اور یہ افسانہ "ہمایوں" میں چھپا تھا کسی کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی۔ کہ اس افسانے کے مصنف وہی حمید احمد خاں ہیں جو ایف اے کی ایک کلاس کو انگریزی کمپوزیشن سکھاتے ہیں۔ کافی مدت بعد مجھے اس حقیقت کا علم ہو گیا، میں نے جب ان سے 'مصور' کا ذکر کیا تھا، تو انھوں نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر یوں نفی میں سر ہلا دیا تھا جیسے یہ افسانہ انھیں پسند نہیں، اور وہ اس تصنیف سے دست بردار ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ کونسی نفاست خیالی تھی جس سے ان کا یہ افسانہ محروم تھا؟ اس کا کبھی انھوں نے ذکر نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ لوگ اسے یک سر فراموش کر دیں۔ پروفیسر حمید احمد خان کی نفاست ان کے خوننابہ جگر کی کشید گاہ میں پرورش اور ترتیب پاتی تھی۔ غالبیات سے متعلق کوئی 'مقالہ' اور غزل کے ارتقائی مراحل پر مبنی کوئی مضمون ہو، دیوان غالب کے نسخۂ حمیدیہ کا دیباچہ ہو یا خواجہ الطاف حسین حالی کے حیات و کلام کا جائزہ ہو، وہ ہر جگہ ہر مقام پر اسی خونِ جگر سے آمیز کی ہوئی نفاست سے کام لیتے تھے۔ انھوں نے بہت کم لکھا ہے، مگر جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے نفاست کے مقررہ معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے، ان کی ساری تخلیقات ضخیم جلدوں سے دامن کشا چند سو صفحات میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ مگر یہی چند سو صفحات ادب کے افق پر چاندی کا روپ دھارے بڑی نفاست سے سجی ہوئی ہیں۔

نفاست ان کی پوری زندگی پر حاوی ہو گئی تھی۔ یہ ہر کام میں باقاعدگی یہ خود کو ہر وقت چست و چو بند رکھنے کی پابندی اسی نفاست پسندی کے مظاہر تھے اور یہ بھی نفاست ہی کا ایک رخ تھا کہ وہ طے شدہ پروگرام میں ایک منٹ کی بے قاعدگی، بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی کو اپنے دفتر میں یا گھر میں پانچ بجے ملنے کے لیے کہا ہو تو آنے والے کو لازمی طور پر اس وقت ان کے پاس آنا چاہیے، جب گھڑی کی گھنٹے کی سوئی پانچ کے ہندسے پر پہنچ جائے۔ اس میں ایک لمحے کی کمی بیشی بھی انھیں ناگوار ہوگی، یہ الگ مسئلہ ہے کہ دیر سے آنے والے کی پذیرائی بھی کر دیتے تھے۔ گو شکن آلود پیشانی کے ساتھ۔!

تو یہ ہیں پروفیسر حمید احمد خاں، میرے محترم میرے شفیق استاد، جنھوں نے نفاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ جنھوں نے نفاست کو گہری معنویت بخشی تھی۔ اور جو آج دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہے ہیں۔ اور مجھے فکر ہے کہ گرد آلود ہوا ان کا کفن میلا نہ کر دے! کوئی اس آندھی کو روک نہیں سکتا۔ کون روکے گا۔

ایک جاپانی شاعر تھا جس نے کہا تھا۔

باغ کے تختے پر لکھا ہے کہ پھول مت توڑو
مگر ہوا یہ بات نہیں پڑھ سکتی....

اور آندھی کو کون سمجھائے کہ تو اس شخص کا کفن میلا نہ کر، اس کی زندگی سراپا نفاست تھی۔

کاش آندھی یہ بات سمجھ سکے۔

افکار — سالانہ ممبر بن کر "ندیم نمبر" رعایتی قیمت میں حاصل کیجیے